باب التقریظ والانتقاد

برِاعظم پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ

سعید احمد اکبر آبادی

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا شمار برِصغیر پاک و ہند کے نامور مورخین میں ہوتا ہے موصوف آج سے تیس برس پہلے اس وقت تاریخ و ادب کے میدان میں اترے جب اس میدان میں خال خال شہسوار نظر آتے تھے۔ سلطنتِ دہلی کے نظم مملکت پر آپ کی پہلی کاوش بازار میں آتے ہی آپ کی شہرت برِصغیر پاک و ہند کے علاوہ یورپ اور امریکہ تک جا پہنچی۔ اور آپ عہدِ سلطنت کے ایک بڑی سند سمجھے جانے لگے۔ علمی اور ادبی مشغلے کے ساتھ آپ نے تحریک آزادی میں بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور آپ کی خدمات کو خود بانیٔ پاکستان نے سراہا ہے۔

تقسیم ملک کے بعد آپ کا تقرر پنجاب یونیورسٹی میں بحیثیت صدر شعبۂ تاریخ ہوا لیکن جلد ہی لیاقت علی خاں مرحوم نے آپ کو اپنی کابینہ میں شامل کر لیا۔ جب وزارت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوئے تو آپ امریکہ چلے گئے۔ اور وہاں کی بلند پایہ درسگاہوں میں علمِ تاریخ پڑھاتے رہے۔ اسی زمانہ میں آپ نے اپنی قابل قدر تصنیف THE MUSLIM COMMUNITY OF THE INDO-PAKISTAN SUB CONTINENT. کے لیے مواد جمع کیا

لہ از ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی۔ مترجم بلال احمد زبیری۔ ضخامت ۳۹۶ صفحات، فہرست اسناد محولہ، اشاریہ خوبصورت ٹائپ مجلد مع گرد پوش قیمت ۳۶ روپے۔ پتہ: شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی کراچی۔

جسے آپ نے ۱۹۶۲ء میں شائع کیا۔ زیر تبصرہ کتاب اسی کتاب کا اردو ترجمہ ہے جسے جناب ہلال احمد زبیری نے کراچی یونیورسٹی کی طرف سے شائع کیا ہے۔

برِ صغیر کے علمی و ادبی حلقوں میں ڈاکٹر اشتیاق احمد قریشی کا جو مقام ہے، وہ محتاجِ تعارف نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نہ صرف تاریخ داں بلکہ ایک ماہر تعلیم اور مفکّر کی حیثیت سے بھی ممتاز ہیں۔ آپ نے برسہا برس کے غور و فکر کے بعد زیر تبصرہ کتاب تحریر فرمائی ہے اور اس عرصہ میں آپ کے خیالات میں جو پختگی آئی ہے اس کی نمایاں جھلک زیر تبصرہ کتاب میں نظر آتی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ تاریخ کے طلباء کے لیے نہ صرف ضروری بلکہ ناگزیر ہے۔ فاضل مصنّف نے حضرت مجدّد الف ثانیؒ، اورنگ زیب عالم گیر، شاہ ولی اللہؒ، سید احمد شہیدؒ، اور سر سید احمد خاں پر جو ابواب لکھے ہیں وہ اس کتاب کی جان ہیں۔ ان ابواب میں آپ نے ایک نیا انداز، ایک نئی فکر اور تحقیق کا ایک نیا میدان اہل علم کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ زیرِ نظر کتاب کا نصف آخر نصف اوّل کی بہ نسبت بدرجہا بہتر ہے۔

بایں ہمہ اس کتاب میں کچھ خامیاں بھی رہ گئی ہیں جن کی ذمہ داری فاضل مصنّف کی بجائے مترجم پر عاید ہوتی ہے۔ اکثر جگہ ایسا ہوا ہے کہ ایک ہی صفحہ پر ایک نام مختلف ہجوں میں لکھا گیا ہے مثلاً تیمور اور تمور، شیواجی اور شواجی، مہارانا پرتاپ اور مہارانا پرتاب ڈی گو بجے اور ڈی گونڑےٹے، ویشنورا اور وینتورا، وغیرہ۔ ایک عام قاری اس سے یہی تاثر لیتا ہے کہ مترجم کو خود یہ معلوم نہیں کہ ان لفظوں کے اصلی ہجے کیا ہیں۔ اسی طرح مترجم نے بعض لفظوں کے ہجے اس طرح اپنائے ہیں کہ پڑھنے والے کی طبیعت پر گراں گذرتے ہیں مثلاً سمہ کی بجائے سماء، بلہرا کی بجائے بلھارا، چمبہ کی بجائے چمبا، سومرہ کی بجائے سمرا، دیبل کی بجائے دابل، بھڑوچ کی بجائے بڑوچ اور کارومنڈل کی بجائے کرو منڈل۔ وغیرہ۔

علاوہ ازیں کچھ ٹائپ کی غلطیاں بھی کتاب میں رہ گئی ہیں مثلاً صفحہ ۲۰۰ پر A.G. ARBERRY . کی جگہ A.J. ARBERRY . ہونا چاہئے۔ اسی طرح الکامل فی تاریخ کی جگہ، الکامل فی التاریخ، آثار صنادید کی جگہ، آثار الصنادید۔ قلعہ الاموت کی جگہ قلعہ الموت، حضرت مجدد الف ثانیؒ کی کتاب کا نام ردّ رفاوض کی جگہ ردّ روافض، اور ان کا سال وفات ۱۰۲۴ کی جگہ ۱۰۳۴ اور بحر المواج کی جگہ بحر مواج ہونا چاہئے تھا۔

اسی طرح اکثر جگہ محاورات کا استعمال اور انداز بیان بھی قابل اعتراض ہے۔ مثلاً ایک جگہ "یہ خبر دربار میں آئی" (ص ۱۷۳) تحریر ہے اور "خبر آنا" کا محاورہ ہم نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنا۔ بعض جگہ مترجم نے انگریزی زبان کو اردو میں ڈھالنے میں بڑی لاپرواہی سے کام لیا ہے۔ مثلاً ص ۵۴ پر یہ عبارت پڑھنے والے کی طبیعت پر گراں گذرتی ہے:

"سنیوں کے اسلحہ خانہ میں صرف ایک ہتھیار ایسا تھا جو مذہبی تبلیغ کے ماہر اسمٰعیلی مبلغین کے خلاف استعمال کیا جا سکتا تھا اور جس کی کامیابی کا کوئی امکان تھا" - - - - - - - - اس طرح کے ترجمہ سے گریز ہی بہتر ہے۔ اسی طرح ص ۲۱۳ پر یہ عبارت: "اگر اکبر کو اودے پور کے مہارانا پرتاب سے بھگتنا پڑا تھا تو دارا شکوہ کو شیواجی سے بھگتنا پڑتا" بالکل مہمل اور بے معنی ہے۔ اسی طرح ص ۱۷۹ پر مشہور اسلامی اصول کی جگہ مسلّمہ اسلامی اصول ہوتا تو مناسب معلوم ہوتا۔ اسی طرح مترجم نے اکثر مواقع پر تصوّف کی بجائے صوفیت کی نئی اصطلاح استعمال کر کے عبارت کا مزہ کرکرا کر دیا ہے۔

جہاں تک فاضل مصنّف کا تعلق ہے وہ بھی معصوم عن الخطا نہیں ہیں اور ان سے بھی کئی قابل گرفت لغزشیں ہوئی ہیں۔ مثلاً ص ۵۸ پر انھوں نے سید جلال الدین (سرخ پوش) بخاری اور سید جلال الدین (مخدوم جہانیاں) جہانگشت کو ایک ہی ہستی ظاہر کیا ہے حالانکہ مؤخر الذکر، اول الذکر کے پوتے ہیں۔ اسی طرح ص ۶۱ پر انھوں نے سلطان سخی سرور (متوفی ۱۱۸۱)

کو سید علی ہجویری رحؒ (متوفی ۱۰۷۵) کا مرید بنایا ہے۔ جو حقیقت سے بعید ہے۔ اسی طرح ص۲۰ کے مطالعہ سے قاری یہ تاثر لیتا ہے کہ حضرت مجدّد الف ثانی اکبر کی بجائے دارا شکوہ کے خلاف برسرپیکار رہے اور یہ کہ یہ دونوں ہمعصر تھے۔ فاضل مصنّف نے ص۸۰ پر یہ تحریر فرمایا ہے کہ ملّا شیری نے سورج کی مدح میں ایک ہزار اشعار لکھ کر اکبر کو دیئے تھے حالانکہ اس جگہ یوں ہونا چاہئے تھا کہ ملّا شیری نے سنسکرت زبان میں سورج کے ہزار نام اکبر کو منظوم کر کے دیئے تھے۔ اسی طرح ص۲۳۱ پر نظام الملک آصف جاہ اوّل کو "مغل حاکم" لکھا ہے جو حقیقت سے بعید ہے۔ ص۱۷۴ پر ڈاکٹر صاحب نے بیرم خاں اور شیخ گدائی کے شیعہ ہونے پر شبہ ظاہر فرمایا ہے جو مزید ثبوت کا محتاج ہے۔ اسی طرح ص۱۷۱ پر آپ ملّا عبد النبیؒ کو حنفی ظاہر کرتے وقت یہ فراموش کر گئے ہیں کہ وہ امام ابو حنیفہؒ کی نسل سے تھے۔ اور اسی وجہ سے علماء ان کے خلاف تھے کہ وہ امام صاحب کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے بھی قتل مرتد کے مسئلہ میں امام صاحب کے مسلک کے پابند نہ تھے۔ آپ نے ص۲۶۷ پر جو یہ تحریر فرمایا ہے کہ سکھوں نے معرکۂ بالاکوٹ کے بعد سید احمد شہیدؒ کی میت کو جلا کر اس کی راکھ دریا میں بہادی تھی، ابھی مزید ثبوت کا محتاج ہے۔

یوں کہنے کو تو یہ "برصغیر پاک و ہند کی ملت اسلامیہ کی تاریخ ہے لیکن اس میں مسلم لیگ کے علاوہ دوسری سیاسی تحریکوں کا ذکر تک نہیں آیا۔ مجلس احرار اور خاکسار تحریک کے ذکر سے یہ کتاب یکسر خالی ہے۔ اسی طرح ملت اسلامیہ کی تاریخ کی تدوین کے وقت دارالعلوم دیوبند کی ایک صدی کی دینی خدمات سے چشم پوشی کی گئی ہے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا محمد الیاس کی خدمات کا ذکر سرے سے ہی نہیں آیا۔ مولانا ظفر علی خاں تو تحریک آزادی کے علمبردار تھے اور ان کا شمار ان بزرگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اس صدی کے آغاز میں ملّتِ اسلامیہ کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا۔ اگر مولانا ابوالکلام آزاد کا ذکر اس کتاب میں آسکتا ہے تو مولانا ظفر علی خاں سے

کیا قصور سرزد ہوا جو ان کا ذکر تک اس کتاب میں نہیں آیا۔ اس سے بھی زیادہ اچنبھے کی بات یہ ہے کہ سرسید احمد خاں اور علی گڈھ تحریک پر فاضل مصنف نے بڑا لمبا چوڑا باب باندھا ہے لیکن اس میں نواب وقار الملک کا نام تک نظر نہیں آتا۔ اسی طرح مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کی تحریک کا ذکر بھی اس کتاب میں مفقود ہے۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کی خدمات اور سابق صوبہ سرحد میں صاحبزادہ عبدالقیوم کی اشاعتِ علم کی سرگرمیوں کے ذکر سے بھی یہ کتاب یکسر خالی ہے۔ حالانکہ انجمن اور صاحبزادہ نے وہی کام کیا جس کے لیے سرسید احمد خاں عمر بھر کوشاں رہے۔ ان وجوہات کی بنا پر ایک عامی یہ کتاب پڑھ کر یہ تاثر لیتا ہے کہ یہ کتاب ایک خاص نقطۂ نظر اور ایک خاص سیاسی نظریہ کے تحت لکھی گئی ہے حالانکہ اگر یہ "ملت اسلامیہ" کی تاریخ تھی تو اس میں ان تحریکوں کا بھی ذکر آنا چاہیئے تھا جن کے نظریات سے فاضل مصنف کو اتفاق نہیں۔ ان باتوں کے باوجود اس کتاب کا مطالعہ تاریخ کے طلبا اور اہل علم کے لیے سودمند ہوگا۔

اردو کتابوں پر انعام میر ایوارڈ

آل انڈیا میر اکادمی لکھنؤ نے ۱۹۶۷ء کی حسب ذیل کتابوں پر میر ایوارڈ دیا گیا۔

۱۔ ڈاکٹر نیر مسعود لکھنؤ یونیورسٹی کی کتاب ـــــ رجب علی بیگ سرور پر چھ سو روپے

۲۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کی کتاب۔ ذوق و جستجو چار سو روپے۔

۳۔ ڈاکٹر مختار الدین آرزو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کی کتاب ـــ گلشنِ ہند۔ پر دو سو پچاس روپے

۴۔ پنڈت بال مکند عرش ملسیانی کے شعری مجموعہ ـــ شرار و سنگ پر دو سو پچاس روپے

آل انڈیا میر اکادمی کی طرف سے ہر سال اردو کی بہترین علمی، ادبی، تاریخی، تنقیدی، تخلیقی، اور شعری مطبوعات پر میر ایوارڈ پندرہ سو روپے کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

۱۹۶۸ء کی مطبوعات جو ایوارڈ میں شامل کرنے کے لئے بھیجی جائیں۔ ان کی پانچ پانچ جلدیں جناب مظفر احمد لاری صاحب جنرل سکریٹری آل انڈیا میر اکاڈمی، اقبال منزل، وزیر گنج، لکھنؤ کے پتہ پر ۱۰ دسمبر ۱۹۶۹ء تک پہنچ جانی چاہئیں۔

اکادمی کی طرف سے ہر سال ساڑھے تین تین سو روپے کے چھ ادبی وظیفے بھی دیے جاتے ہیں۔ ۱۹۶۸ء کے لئے یہ وظیفے اکادمی نے اصحاب ذیل کو پیش کئے جانے کا اعلان کیا ہے۔

۱۔ محمد اعجاز صدیقی ایڈیٹر شاعر بمبئی۔ ۲۔ وفا ملک پوری ایڈیٹر صبح نو پٹنہ۔ ۳۔ سید محترم الاکرام، مرزا پور۔ ۴۔ سکھدیو پرشاد بسمل الہ آباد۔ ۵۔ نازش پرتاپ گڑھی، پرتاپ گڑھ۔ ۶۔ مائل ملیح آبادی، ملیح آباد۔

[illegible]